روحانی نظام

مؤلف

الحاج قاری محمد ارشاد علی

مولوی عالم (نظامیہ) بی۔کام (عثمانیہ)

تفصیلات طباعت

نام کتاب	روحانی نظام
مؤلف	الحاج قاری محمد ارشاد علی
صفحات	44
اشاعت	جون ۲۰۱۳
قیمت	مُفت
اہتمام	صاحبزادہ محمد طاہر علی
ای میل	islahitohfa@gmail.com

مزید موضوعات

http://archive.org/details/@islahi_tohfa

ترتیب

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

روحانی نظام

حدیث: جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا فرمایا تو وہ ڈولنے لگی، تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا فرمایا اور اس پر جم جانے کے لیے فرمایا۔ فرشتوں نے پہاڑوں کی شدّت اور سختی پر تعجب کیا اور عرض کیے: اے پروردگار! تیری مخلوق میں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: لوہا، اس پر فرشتوں نے عرض کیا کہ لوہے سے بھی زیادہ سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہاں آگ ہے، پھر عرض کرنے لگے الٰہی آگ سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: ہاں پانی ہے، پھر انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار پانی سے بھی زیادہ سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہاں ہوا ہے، پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ کوئی سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہاں آدم کی اولاد، جو دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔

عناصر اربعہ: (۱) آگ (۲) پانی (۳) ہوا (۴) مٹی، سے موالید ثلاثہ اور انسان کی پیدائش ہوئی، (animals, plants, and non living things) یعنی: نباتات، جمادات (بے جان چیزیں)، حیوانات اور انسان۔
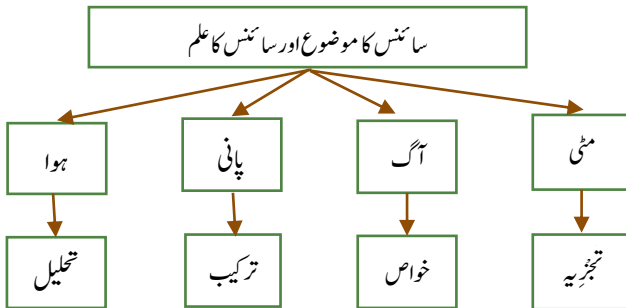
عناصر (Elements) کی قوتوں کا باہمی اختلاف

(Mutual differences) اور لطافتوں (purity) کا فرق

سائنس کا موضوع بلحاظ حقیقت یہی عناصر اربعہ: آگ، پانی، ہوا اور مٹی ہیں۔ ان چاروں کے تفصیلی معلومات اور اِن کے خواص (properties) اور اِن کے آثار، پھر کیمیائی طریقہ (chemical method) پر ان کی تحلیل و ترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو ایجاد کرنا سائنس اور سائنس داں کا مخصوص علم اور عمل ہو جاتا ہے۔

ان چار قوتوں کا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان عناصر کے خواص یکساں نہیں ہیں۔ ان کے خواص اور ان کے جواہر میں فرق ہے۔ ان میں کوئی عنصر ضعیف اور کمزور ہے اور کوئی قوی ہے۔ یہ ضعف (Weakness) قوت کا فرق بھی بے جوڑ یا اتفاقی نہیں، بلکہ اصولی اور معیاری ہے۔ وہ معیار یہ ہے کہ ان چار عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے اسی قدر اس کی طاقت بھی بڑھتی گئی ہے۔ پھر طاقت کے اندازے سے اس عنصر میں غلبہ، تسلط اور اقتدار کی شان قائم ہوتی گئی ہے۔ اور جس حد تک لطافت میں کمی ہو کر کثافت (impure) میں اضافہ ہوتا ہے اسی قدر اس عنصر میں کمزوری آتی گئی ہے۔ پھر کمزوری کے بقدر اس میں بے بسی، اور ذلت اور پستی ہے۔ (لطافت کے معنیٰ عمدگی، خوبی، ترقی، ملائمت، پاکیزگی اور صفائی ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات لطافتوں کا منبع ہے

راز اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطافت ایک وصف کمال (Attribute perfection) ہے جو کثافت (impure) کی ضد ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن (Repository) اللہ

کی ذات ہے۔ چنانچہ بے انتہائی لطیف ہونے سے وہ آنکھوں سے اوجھل ہے، اور ادراک (perception) کی حدود سے بہت دور ہے۔ اس کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ تمام جہانوں اور تمام عالموں پر اس کی شہنشاہی کا نظام محکم ہے۔ اس لیے جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہو تو وہ درحقیقت "اسکی" ذات کا عکس ہے، جس کا اثر بقدر استعداد اس نے قبول کر لیا ہے اور قبول عصر کے لیے مناسبت ضروری ہے۔اس لیے ہر لطیف شے کو بقدر لطافت حق تعالیٰ سے مناسبت ہے اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی کسی چیز کو اللہ کی ذات کے ساتھ قرب و تناسب قائم ہوگا وہ اسی قدر قوی غالب اور بااقتدار بنتی جائے گی، اور کثافتوں کو اس کی ذات سے دوری اور بیگانگی ہے اور وہ چیز اسی قدر پست، مغلوب اور ذلیل ہوتی جاتی ہے۔

قرب کی دو قسمیں ہیں:

ایک حسی قرب ہے۔ یعنی جس کو محسوس کیا جاتا ہے کہ آدمی "پانی" کے قریب ہو تو پانی کے آثار و برودت (ٹھنڈک) اور سکون وغیرہ سرایت (absorption) کر جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر " آگ " کے قریب ہو تو حرارت و گرمی وغیرہ اور اگر" مٹی" سے قریب ہو گئے تو پیوست(Attachment) اور خشکی کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔

بالکل اسی طرح قرب کی دوسری قسم ہے۔جس کو"وصفی قرب" کہتے ہیں کہ آدمی کسی وصف کے ذریعے بھی ذات بابرکات سے قرب اور مناسبت پیدا کر لیتی ہے تو اس کی بقدر استعداد، صفات ربانی اور صفات عالیہ کا مرکز بنتی چلی جاتی ہے۔اس

کے ساتھ اس میں استغناء(self-sufficiency) کا ظہور ہوتا ہے۔ قوی تر، غالب تر اور رفیع المنزلۃ (High status) ہو جاتا ہے۔

فرق صرف اسقدر ہے کہ مادیات کے میدان میں حِسّی " قُرب " ہوتا ہے اور اس کی بارگاہ میں حِسّی رسائی نہیں ہوتی بلکہ اس کا " قرب وصفی " ہوتا ہے۔ یعنی جو چیز یا جو شخص اخلاق اور اوصاف کے لحاظ سے قُرب اور مناسبت کا درجہ حاصل کر لے گی، وہی اس کے کمالات کے بقدر استعداد حصّہ پانے لگتی ہے۔ پھر اسی اعتبار سے غلبہ اور بے پرواہی اس کے حصے میں آتا ہے۔

معرفت نفس کیا چیز ہے؟

نفس کی اصلاح، بغیر نفس کی پہچان کے ناممکن ہے۔ معرفت نفس کے معنی یہ ہیں کہ انسان، نفس انسانی کی فطرت کو جان لے، نفس میں ملکوتی اور شیطانی قوت کے درمیان کی کشمکش کو جان لے، اور ان پر نظر رکھے۔ اپنی نفس کے احوال کو سمجھے، بار بار کے تجربے سے اور غور و فکر سے اپنی سیرت کے کمزور پہلوؤں کا شعور ہم کو ہو جاتا ہے کہ، کہیں کبر، کہیں غصہ ہے، تو کہیں بخل اور کہیں اپنے آپ کو بہتر تصور کرنا ہے۔ ان سب پہلوؤں کو جان لینے کے بعد مجاہدہ نفس کرنا ہے۔

عناصر اربعہ کے خواص

مٹی: سب سے زیادہ کثیف (impure) ہے اور دوسروں میں بھی اس سے کثافت (impurity) آجاتی ہے۔

آگ: مٹی کے برخلاف آگ ہے کہ اس پر کسی چیز کو گرم کرتے ہیں تو گاڑھا پن آجاتا ہے۔ کہ آگ اُس چیز کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے۔ سو آگ اس میں اپنی طرف سے کچھ نہیں ڈالتی بلکہ نکال لیتی ہے۔

پانی: سے کسی چیز کو پاک کیا جاتا ہے۔اس طرح پانی کی اصلیت پاکی اور پاکبازی ہے۔ پانی مٹی کی وجہ سے خراب ہو جاتا ہے۔

ہوا: اس طرح ہوا بھی کسی چیز کو خراب نہیں کرتی۔ زمین کے اجزاء گرد و غبار وغیرہ ہوا کو خراب کرتے ہیں۔

زمین کثافت ہی کثافت سے بھری ہے۔ غرض لطافت بالکل نہیں ہونے سے اللہ سے اس کو دوری ہے۔ اس میں کمزوری اور بے عزتی ہے۔ مٹی کا ایک جزء پہاڑ بھی ہیں۔ پہاڑ کی ریت میں کثافت بہ نسبت مٹی کے کم ہوتی ہے، خشک ریت کے ذرات چمکتے ہیں، بہرحال ریت کی ترکیب سے پتھر اور پتھر کی ترکیب سے پہاڑ بنے، تو ان کی عظمت، شان اور قدر و قیمت زمین سے بڑھ گئی۔ پھر پتھروں پر محنت کرتے ہیں، تو ان کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ سنگ خارا، سنگ مرمر، پھر جواہرات، لعل (ایک سُرخ قیمتی پتّھر)، یاقوت۔ بہرحال فرق تو وہی لطافت اور کثافت کا ہے۔ اگر لوہے کا ایک ٹکڑا لیتے ہیں تو وہ پہاڑوں کو گرا دیتا ہے، یہی لوہا اگر آگ میں رکھیں تو وہ آگ کے مِثل ہو جاتا ہے اور اگر زیادہ دیر آگ مے رکھے تو لوہا پانی کی طرح بہہ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ یعنی آگ میں لوہے سے زیادہ لطافت موجود ہے۔ اس طرح آگ لوہے پر غالب ہے۔

آگ پر اگر پانی ڈال دیں تو آگ کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ غرض پانی کی طاقت شدّت کے سامنے آگ کام نہیں کر سکتی۔ پانی بہ نسبت آگ کے زیادہ لطیف ہے۔ آگ پانی کے سامنے عاجز ہے اور پانی، ہوا کے سامنے۔ چنانچہ ہوا اس قدر لطیف ہے کہ آنکھوں سے دیکھنا ناممکن ہے، صرف محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں چیز جس قدر لطیف ہوگی اسی قدر زیادہ طاقتور ہوگی۔ لطیف ہونے سے نہ اس کا رنگ ہے، نہ صورت ہے، لطیف ہونے سے چیزوں کو قبول کرتی ہے، جیسے آواز، خوشبو وغیرہ۔ ان کو قبول کر کے ادھر سے ادھر پہنچاتی ہے، اور جہاں آگ، روشنی اور پانی نہیں پہنچ سکتے، وہاں آسانی سے ہوا پہنچ جاتی ہے۔

۔۔: جامع العناصر، انسان اور اس کی طاقت :۔۔

اگر ان سارے عناصر (آگ۔ پانی۔ ہوا۔ مٹی) اور ان کے تینوں موالید (types of creation) (جمادات، نباتات اور حیوانات) کی بے انتہا شاخوں کو ایک طرف رکھ کر صرف تنہا انسان کو ایک طرف رکھتے ہیں تو انسان ان سب سے زیادہ قوی اور ان پر غالب ہے، اور یہ سب عناصر اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج اور اس سے مغلوب ہیں، لیکن وہ ان میں سے اسی کے زیر تصرف اور کسی سے مغلوب نہیں ہے۔ کیونکہ اولاً تو عناصر کی باہمی اور نسبتی (Reciprocal and relative) طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل آنے سے کھلتی ہے، اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہے۔

← لوہا خود بخود پتھروں کو نہیں کچلتا۔

← آگ خود بخود لوہے کو نہیں پگلاتی۔

← پانی خود بخود آگ بجھانے نہیں جاتا۔

← ہوا کی یہ جزوی قوت خود بخود سیال مادوں کو نہیں اڑاتی۔

اگر انسان ان چار عناصر میں اپنی عقل سے ترکیب (بناوٹ) نہ دیتا رہے، تو یہ اپنا غلبہ نہیں دکھا سکتے۔ انسان چونکہ ان سب عناصر کو استعمال کر کے غلبہ حاصل کرتا ہے اس لیے اس کی طاقتور ہونے کی یہی سب سے بڑی دلیل ہے۔۔۔! زمین کا جگر چاک کرنا، نہریں بنانا، تہہ خانے کھودنا، کنویں کھودنا، معدنیات (minerals) کا نکالنا، جہاز چلانا، کشتیاں چلانا، ، خود سمندر کے پانی کو تحلیل کر کے نمک الگ کرنا۔ غرض آگ سے، ہوا سے۔ انسان ایک خادم کے طور پر کام لیتا ہے۔

عناصر اربعہ کے اخلاق اور انکی محتاجانہ خاصیتیں

عناصر اربعہ میں محتاجگی کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ ہر چیز کی خیر اور شر اس کی طبعی (Natural)اخلاق سے پھوٹتی ہے۔ ان عناصر کے مادے (matter) میں جبلی (instinct)اور طبعی اخلاق ہی سر سے پاؤں تک محتاج اور غلام ہیں۔ اس لیے انسانی نفس جس حد تک بھی مادہ اور مادیات کا شغل قائم رکھے گا اسی حد تک محتاجی غلامی کا اکتساب (self gain) کرتا رہے گا۔ چونکہ انسانی نفس امّارہ کا پیدا ہونا، انہیں عناصر اربعہ (four Elements) یعنی مٹی ،آگ، پانی اور ہوا سے ہے اس لیے وہ انسان کو پستی اور محتاجگی کی طرف لے جاتا ہے، جو درحقیقت ان عناصر کی طبعی اور خاموش رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر اس انسانیت پر روحانیت کا نور فائز نہ کیا جائے یا وہ اپنی روحانیت کی پناہ میں نہ آجائے تو یہ مادہ اور اسکے جبلی اخلاق ایک لمحہ

کے لیے بھی اسے محتاجگی سے نکلنے نہیں دیتے، کہ مادے کی خلقت اور جِبلّت ہی بے بسی اور محتاجگی ہے۔

مٹی : انسان میں مٹی کے عناصر کا غالب وصف (dominant attribute) یہی حرص (Greed) اور بخل یعنی کنجوسی ہے۔اس کا منشاء حرص و لالچ ہے یہ سب ملکر انسان میں محتاجگی اور غلامی پیدا کرتے ہیں۔ یہ وصف زمین میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے اسکی محتاجگی اور ذلّت بھی دیگر عناصر (آگ، پانی، ہوا) سے زیادہ ہے۔ ضرورت ہے کہ حرص اور بخل کی بجائے سخاوت (Generosity) اور ایثار (دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیع دینے کا عمل) اپنے میں پیدا کرے پھر اس سے بے غرض عزت اور محبوبیت پیدا ہو گی۔

آگ : آگ سر تا پا (from top to bottom) تعلّی (اونچاپن) ہے۔ انسان میں آگ کا ایک جز ہے۔ چنانچہ بدنی حرارت، بخار وغیرہ اس کی دلیل ہے۔ انسان ہوش سنبھالتے ہی اس میں جبلی (instinct) طور پر غرور، تکبر، شیخی، انانیت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ جو حقیقت میں آگ کا اثر ہے۔ آگ کا وصف ہے۔ چنانچہ انانیت سے مغلوب ہو کر جب انسان میں جوش و غضب اور غصے کی لہر دوڑ جاتی ہے تو اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، انانیت کا تقاضہ ہے کہ اپنی بڑائی قائم رکھے، یہ بھی محتاجگی ہوئی کہ اپنی بڑائی کو قائم رکھنے کے لیے آدمی دوسروں کا محتاج ہو گیا۔ عزت ہماری ہو اور اس کا بڑھانا اور گھٹانا دوسروں پر مبنی ہو۔ اب اس کی خاطر دوسروں کو خوش رکھنا ضروری ہو

گیا، گویا آدمی اپنی بڑائی کا بھوکا اور اس کی غذا دوسروں کے پاس ہے۔اس کے برخلاف تواضع ہے البتہ اسکی خاطر نفس پر قابو پانا ضروری ہے۔

پانی: اس کے طبعی اخلاق میں بے چینی ہے۔ انسان میں بھی پانی کا جز نظر آتے ہے۔ جیسے انسان میں تھوک ہے جو کے پانی ہے، بلغم ہے جو کے پانی ہے ،پیشاب ہے جو کے پانی ہے۔پسینہ ہے جو کے پانی ہے۔ اس لیے انسان میں برداشت کا مادہ نہیں ہوتا بلکہ بے چینی کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی محتاجگی ہے۔ اس کے برخلاف برداشت ،بے نیازی اور خود کو قابو میں رکھنا قدرت کی دلیل ہے۔

ہوا: انسان کی تخلیق میں ہوائی جز بھی ہے۔ جیسے ریاح (gases)، سانس وغیرہ۔ ہوا میں انتشار (بے ترتیبی) اور پھیلاؤ (publication) کی خاصیت ہے۔اس طرح انسان بھی چاہتا ہے کہ، ہر جگہ وہ موجود ہو، ہر زماں اور مکاں میں میرا وجود رہے۔ چونکہ اس کا مادی نفس اس قدر پھیلاؤ نہیں رکھتا، اس لیے کم از کم وہ چاہتا ہے کہ ،اس کی شہرت عام ہو، لوگ جگہ جگہ چرچا کریں،اس کا ذکر چلتا رہے۔

بس شہرت پسندی کی صفت میں محتاجگی ہے۔اس کا تعلق عوام سے ہے۔ شہرت پسندی ایک ذلّت کی چیز ہے۔ شہرت پسندی کی ضد تنہائی ، رازداری ہے۔ اس میں دوسروں کی محتاجی نہیں ہے۔ ورنہ مارے مارے پھرنا اور سب کو خوش رکھنا،تاکہ سب میری تعریف کرے، حق کے خلاف بولنا، پروپگنڈے کرنا، سب کو راضی رکھنا، تاکہ سب کی زبان پر میرا ہی نام رہے وغیرہ، وغیرہ۔

عناصر اربعہ کے خوصوصیات

مٹی	آگ	ہوا	پانی
حرص (Greed) بخل یعنی کنجوسی	غرور، تکبر، شیخی، انانیت	شہرت پسندی پروپگنڈے کرنا	بے چینی

نفس امّارہ

فضائل نفس کے چار اصول

مٹی	آگ	ہوا	پانی
سخاوت،ایثار	تواضع، عاجزی	تنہائی، رازداری	قناعت

النفس اللوامة ⟵ نفس مطمئنه
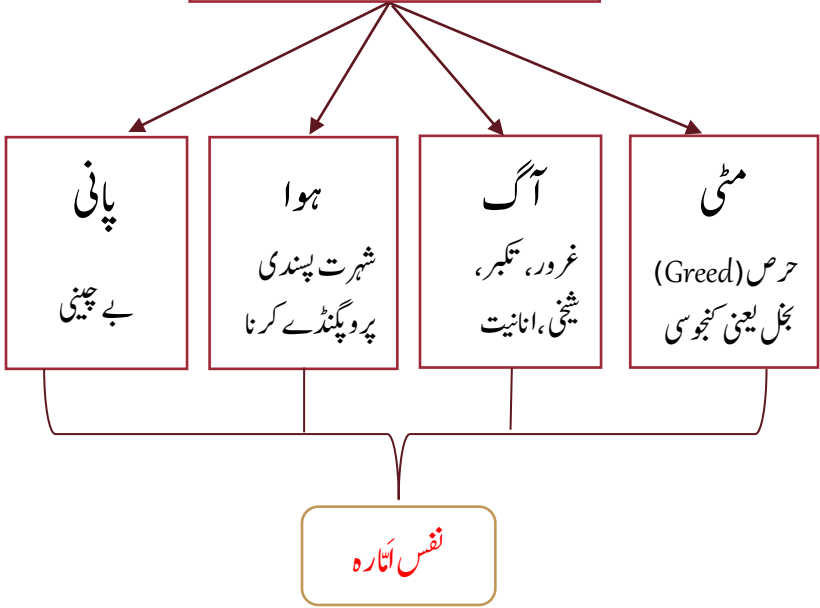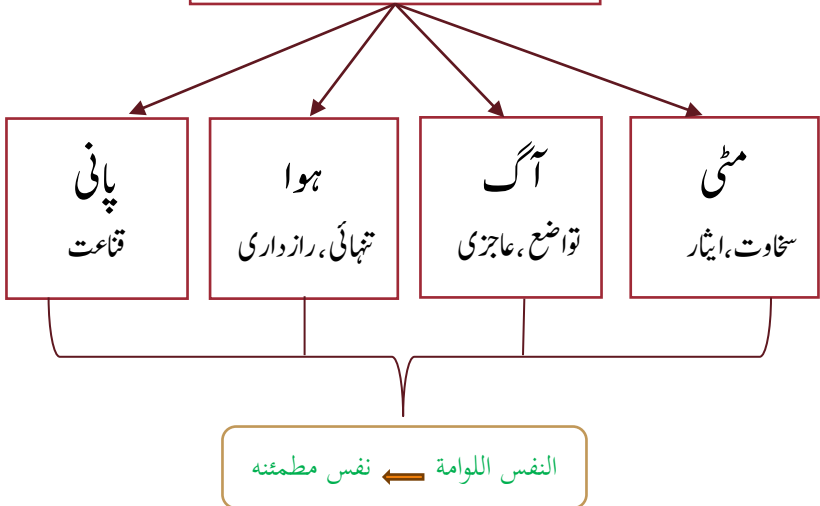
اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اور

مادی اخلاق کا مظہر فعل امساک یعنی لینا ہے۔

مادی اخلاق کا حاصل بجز خود غرضی اور خود طلبی کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ بخل ہو، یا حرص، یا شہرت پسندی ہو، یا تکبر، سب کی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال و جاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامن میں سِمٹ کر آ جائے۔ چنانچہ قبض اور بخل میں چیزوں کو دوسروں سے روکا جاتا ہے۔ حرص و ہوس کا تقاضہ یہی ہے کہ دنیا پوری اپنی ہو جائے۔ تکبر کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر خوبی کو اپنے سے منسوب اور دوسروں سے اس کی نفی کر دی جائے، دوسروں کی خرابیوں کو عام کرنا اور دوسروں کی خوبیوں کو دفن کرنا، اپنی خرابیوں کو چھپانا اور خوبیوں کو عام کرنا وغیرہ۔

شہرت پسندی میں بھی یہی ہوتا ہے کہ اپنے قول اور اپنے فعل اور اپنی ہر ادا کو سب لوگ پسند کریں، اپنی خصوصیات کو عام کریں اور دوسروں کی خصوصیات کو عام نہ کریں۔

اسلام مسلمانوں کو تین باتیں سکھاتا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ ایک مومن کا مقام خدا کے سامنے عبدیت کا مقام ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ نسل انسانی کے ساتھ اس کا رشتہ، رشتۂ اُخوّت (brotherhood) اور مساوات (equality) کا رشتہ ہے۔

(۳) تیسرا مادی کائنات پر وہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے حکمران اور متصرف ہے۔

مقام عبدیت کا تقاضہ ہے کہ کبر و غرور، علم و قوت، ظلم و تشدّد کے رُجحانات کے دروازے بند ہوں۔ عبدیت کا اشتراک یہ چاہتا ہے کہ وہ نسلی، جغرافیائی اور طبقاتی اونچ نیچ اور باہمی کشاکش کو ختم کرے اور خلیفۃ اللہ ہونے کے تقاضے بھی پورے کرے۔ مذکورہ تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اخلاق کی ابتداء، ایثار نفس سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی اپنی خواہشات کی قربانی دینا۔ چنانچہ اعلیٰ اخلاق کا حصول اُسی وقت ممکن ہے، جب قربانیاں بھی اپنے خواہشات کے مقابل، اعلیٰ پیمانے پر ہوں۔ خواہشات کے مقابل ایثار دراصل ایک مقام کشمکش اور مقام امتحان ہے، مومن کا کامیاب ہونا ضروری ہے۔

روحانی اخلاق کا مظہر فعل انفاق یعنی خرچ کرنا ہے

"روحانی اخلاق" ہر حیثیت سے، ہر کیفیت سے "مادی اخلاق" (Material ethics) کی ضد ہیں، تو افعال روحانی بھی مادی افعال کی ضد ہیں۔ مادی اخلاق کا اثر خود غرضی ہے، تو روحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چنانچہ ایثار، تواضع، اخفا اور قناعت ان میں سے کسی ایک خلق کی بنیاد بھی نفس کی خود غرضانہ خواہش پر نہیں ہے کہ سب کچھ تنہا اسی کو مل جائے بلکہ اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ

"سخاوت" میں اپنی چیز دوسروں کو دے دی جاتی ہے۔

"قناعت" میں دوسروں کی چیز انہی کے لیے چھوڑ دی جاتی ہے۔

"تواضع" میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے۔

"اخفا" میں دوسروں کی عزت کے لیے پورا میدان دے دیا جاتا ہے۔
غرض روحانی اخلاق کی بنیاد دوسروں سے چیزوں کو روکنے پر نہیں ہیں بلکہ دوسروں کو دینے پر ہے۔
سخاوت اور قناعت میں یہ فعل "انفاق مالی" (Financial disbursement) سے ظاہر ہوتا ہے اور تواضع اور اخفا میں "انفاق جاہی" (tolerance) سے ہوتا ہے مگر "استغناء مالی" (Financial freedom) ہو یا "استغناء جاہی" (tolerance freedom) ہو بغیر فعل انفاق کے کھل نہیں سکتا اور یہ مشاہدہ ہے کہ جاہ و مال سے بے نیازی ایک طرف تو غیروں سے غنی بنا دیتا ہے اور دوسری طرف اپنے میں بے غرضی مضبوط کر دیتی ہے۔

اس لیے ان روحانی اخلاق کا اثر وسعت حوصلہ، استغناء، وقار، خودداری، بے نیازی اور بے احتیاجی نکلتا ہے جس کے ظہور کا ذریعہ انفاق ثابت ہوتا ہے۔
شریعت کی اصطلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان و مال و آبرو اور قول اور عمل کو مالک الملوک کے لیے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں، پھر صدقہ کرنے میں چونکہ محبوب محبوبات نفس کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر بھاری ہے اس لیے اس کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے۔
صدقے سے بخل کی جڑ کٹ جاتی ہے جو کہ ارضی خلق تھا۔
پھر اس سے محتاجگی بھی کم ہونے لگے گی اور آہستہ آہستہ استغناء آئے گی۔ ایسی طبیعت والا دوسروں کی چیز پر نگاہ حرص نہیں ڈالے گا، نہ کسی چیز کو دیکھ کر بکھرے گا۔ وہ کم سے کم پر اپنے نفس کو راضی رکھے گا۔ بخل کے خاتمے سے، اپنی چیزوں سے محبت ختم ہو گئی اور حرص کے ختم ہونے سے غیر کی چیز سے محبت ختم ہو گئی۔

اس طرح ایک انسان مالی سلسلے میں نہ اپنا غلام رہا اور نہ دوسروں کا،اور اگر یہ "صدقہ" پوشیدگی کے ساتھ کیا گیا تو نام و نمود اور ریا کی جڑ بھی کٹ گئی۔ پھر اس سے شہرت پسندی اور نام آوری کی خواہش بھی ختم ہو گئی،اور اس کی جگہ استغناء نے لے لی۔"تعلّی" اور "ترفع" کا علاج بھی "انفاق اخفاء" میں ہے۔"اخفاء تام" سے خود پسندی اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ بہر حال استغناء ایسی چیز ہے جو انسان کو ہر قسم کی محتاجگی سے بچاتی ہے۔

روح اور بدن کا مجموعہ انسان ہے

عناصر میں انسانی تصرفات کی وجہ سے مادی دنیا میں ترقی ہے۔انسان اپنی ایجاد پسندی کے شوق میں ان عناصر کی تحلیل و ترکیب (process and analysis) کر کے نئی نئی چیزیں ایجاد کر رہا ہے۔ پانی کو پانی سے ٹکرایا " بجلی" پیدا کیا، گویا پانی میں آگ لگایا، پھر اس بجلی کو تار کے ذریعے دنیا کو ملانے لگا، غرض ساری کائنات کے نام میں دم ہے اس ڈیڑھ گز چھ فیٹ (six feet) مخلوق سے۔ خشکی اور تری (land and water) کی ساری ہی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس طرح عناصر اربعہ (مٹی، آگ، پانی، ہوا) اور موالید (types of creation) (جمادات، نباتات اور حیوانات) ثلاثہ اس کی غلام ہیں۔

انسان کے ظاہر میں تو کوئی لطیف چیز محسوس نہیں ہوتی جس طرح عناصر اربعہ میں محسوس ہوتی ہے پھر اخر یہ لطافتوں کو زیر کرنے کی قوت لطافت کہاں چھپی ہوئی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ لطافت اور طاقت اس کے بدن کی نہیں

کیونکہ بدن تو وہی عناصر اربعہ کا مجموعہ ہے۔ ہوا لطیف ہونے کے باوجود اس کو محسوس بھی کیا جاتا ہے۔ایسی صورت میں اس سے لطیف تر چیز ہونی چاہیے، کہ باوجود رگ و پے (whole body) میں سمائے ہوئے ہونے کے کبھی اس کا دھکا تک محسوس نہیں ہوتا اور وہ اس قدر لطیف ہے کہ بدن کے علاوہ دنیا کے عناصر اربعہ پر غالب آجائے اور ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے سوا اور کون سی چیز ہو سکتی ہے، جس کی صفات یہ ہوں اور انسان مرکب ہے بدن اور روح کا۔

روح نہ صرف عناصر اربعہ سے لطیف تر ہے، بلکہ تمام مادی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے۔ روح کی لطافتیں نہ صرف معنوی اور غیر مرئی ہیں، بلکہ حسّی طور پر بھی اس کی لطافت عالم آشکارا ہیں۔ خود عناصر میں جتنی اقسام کی لطافتیں ہیں، اگر غور کرو تو وہ بھی سب کی سب روح میں موجود ہیں۔

(۱) عناصر کے لطافتوں کو قابو میں لانے کی قوتِ لطافت، انسان کی روح میں ہے۔

(۲) عناصر میں جزوی لطافتیں ہیں، تو روح میں ان ساری لطافتوں کا مجموعہ ہے۔

(۳) عناصر کو اللہ کی ذات سے جزوی مناسبتیں ہیں تو روح کو کلّی مناسبت اللہ کی ذات سے ہیں۔

(۴) لطافت کا منبع اللہ کی ذات ہے، تو طاقتوں کا منبع بھی اللہ ہی کی ذات ہے۔

(۵) جس میں جس قدر لطافت ہو گی وہ اسی قدر اللہ تعالیٰ کی ذات سے قریب ہو گا اور یہ قرب حسی نہیں بلکہ معنوی ہو گا۔

(٦) روح انسانی کو اللہ کی ذات سے نہ صرف مُناسبَت (relation) ہے بلکہ مُماثِلت (resemblance) ہے۔ جیسے روح اور بدن، اللہ کی ذات اور کائنات۔ حق تعالیٰ غیر

مَرئی (بغیر نظر آیے) طور پر تمام کائنات کا ہمیشہ رہنے والا اور صاحب تدبّر ہے۔ تو اسی طرز پر روح، کائنات بدن کی ہمیشہ رہنے والی ہے، وہ ذرا اپنی توجہ ہٹا لے تو کائناتِ بدن درہم برہم ہو جائے، جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔ غرض روح ایک لطیفہ رَبّانی ہے۔ ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾[سورة الإسراء: ٨٥]

روح کی طاقتوں کا غلط استعمال

روح نے اپنی باطنی کمالات صرف کرنے میں جس قدر بھی کوشش کی اور آگ، پانی، ہوا، مٹی کی تحلیل و ترکیب سے جس قدر بھی عجائبات نمایاں کیے اس سے خود روح کو کیا فائدہ پہنچا؟ اور روح کو اس سے کیا شرف ملا؟

اول تو ان سائنسی ایجادات کا نفع روح کو کچھ نہیں، صرف بدن کو پہنچا ہے۔ بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا ہے۔ حقیقت میں روح ہوا سے زیادہ لطیف ہے۔ روح نے ہوا کو مسخر (تابع) کر رکھا ہے۔

اسی طرح ریل، موٹر وغیرہ سب مادی کرشمے ہیں۔ ان کا فائدہ صرف بدن ہی کو ہوتا ہے، نہ کہ روح کو۔ خواہ ٹیلیفون ہو، ٹیلیگراف ہو۔ بس ان سے راحت انسانی بدن کو ہوئی، اور بدن کیا ہے؟ عناصر اربعہ کا مجموعہ ہے۔ یعنی آگ، پانی، ہوا اور مٹی کا ایک گھر ہے۔ گویا باہر کی آگ اور پانی سے اندر کے آگ اور پانی کی خدمت ہوتی رہی۔ اس طرح روح کو جو کہ ان سب سے زیادہ لطیف تر تھی اور جو ان پر حکمرانی کرنے کو تھی اس کو ہم نے دھوکہ دے کر جسم جیسی کثیف چیز یعنی عناصر

کا غلام بنا دیا۔ گویا ایک لطیف چیز کو ایک کثیف چیز کا غلام بنا دیا۔ اس طرح روح کی لطافت آہستہ آہستہ مٹتی رہی۔

روح ایک عالم فرمانروار ہے۔ عقل اس کا وزیر اعظم ہے، اور شرع اس کا قانون ہے، اور کمینہ ،غلام بدن ہے جس کے واسطے سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں۔ کمینہ اس لیے کہ جس قدر بھی اس کے اجزائے ترکیبی ہیں سب بے شعور، لایعقل، جاہل، بے تمیز، ناواقف ہیں۔ ان عناصر اربعہ کی کمینگی کا یہ عالم ہے کہ جو ان سے زیادہ محنت کر کے ان کا قرب حاصل کرے، اسی کے یہ سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بن جاتے ہیں۔ جیسے مٹی کی مورت یا چٹان کی مورت کی پوجا ہوتی ہے اور جب وہ گرتی ہے تو اپنے عابد کو لے مرتی ہے۔ اسی طرح دریا کے کنارے، پانی کے سامنے اگر کوئی ناک رگڑے تب بھی سیلاب اس کو نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک مجوسی لاکھ آگ کی عبادت کرے وہ اس کو جلائے بغیر نہیں رہتی۔ غرض ان عناصر اربعہ کو اپنے دوست اور دشمن میں تمیز نہیں، بس جہاں ان عناصر کے سفلی پن کا یہ عالم ہو ان سے مرکب بدن انسانی سے کب خیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس طرح یہ بدن کمینہ ، نالائق، غلام ہے، جو اپنے ذاتی تعیش کی خاطر روح کو اپنے موافق کر لیا، عقل کو موافق کر لیا، اور شرعی قانون کو طاق میں رکھوا دیا۔ یہ "روح" غفلت زدہ ہو گئی، اور اس کی تمام خوبیوں سے جسم فائدہ اٹھانے لگا اور روح اپنے فائدے میں خالی ہاتھ رہ گئی۔

وہ "روح" جو کمالاتِ ربّانی کا نمونہ ہونے کے سبب استغناء اور قناعت کی اعلیٰ شان رکھتی تھی، وہ "روح" اس لا عقل بدن کی محتاج ہو گئی۔ حالانکہ بدن اس کا محتاج تھا۔ وہ روح جس کو فرشتے کبھی سجدہ کرتے تھے، وہ اپنے غلاموں یعنی عناصر اربعہ کو سجدہ کر رہی ہے۔اس طرح یہ غلام اور غلامی پسند روح، محتاجگی کے اس درجے پر آ گئی کہ یہ اُسی وقت باکمال ہے جب کہ مادی وسائل اس کی خدمت میں ہوں، اور اس وقت محتاج ہے جبکہ مادی وسائل نہ ہوں۔ یہ محتاجگی اور غلامی کی بدترین مثال ہے۔

روح کے کمالات

روح علم معرفت اور لطافتوں اور طاقتوں کا خزانہ تھی۔ اس طرح وہ کسی کام میں اپنے کسی غلام جو بے شعور، اپاہج اور محتاج ہے اس کی محتاج نہ ہوتی۔ وہ آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں بجلی کی محتاج ہو گئی۔ حالانکہ وہ اگر آواز نکالتی تو آواز مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتی اور اگر وہ نقل و حرکت اور مسافت سفر طے کرنے پر آ جائے تو سیکنڈوں میں ہزاروں میل کا سفر طے کر لیتی۔ وہ اگر چاہے تو زمین اس کے لیے سمٹ جاتی، ہوائیں اس کے لیے مسخر ہو جائیں، دریا اس کے تابع ہو جائیں، جنگ وجدال میں ہتھیار کی محتاج نہ ہوتی، یہ سب اس لیے ہوتا کہ روح لطافتوں کے سبب اللہ پاک کی ذات سے مناسب تامہ رکھتی تھی اور اپنے کاموں میں وسائل کی محتاج نہیں تھی بلکہ وسائل اس کے محتاج تھے۔

بہر حال اگر مادیات (عناصر اربعہ) سے ایسے عجائبات کا ظہور ہو سکتا ہے اور وہ بھی باطفیل روح، تو خود روح اور روحانیت کے ذریعے اس سے بہت آگے عجائبات کا کارخانہ کھل جانا تھا۔ تاکہ اس غیر محتاج روح کا کمال پورا پورا ظاہر ہو سکے۔ وجہ اس کی صرف ایک ہے کہ روح محکوم ہو گئی، محتاج ہو گئی اور بدن حاکم ہو گیا اور غالب ہو گیا۔

بدن مخلوق ہے۔ مخلوق میں عیب اور نقص ہوتا ہے، لیکن روح مخلوق نہیں ہے بلکہ خالق کی طرف سے ہے۔ روح کا جو کمال تھا وہ کھو گیا، صرف اس لیے کہ وہ بھی ایک کمال اور عیب دار چیز کی طرف رغبت کی۔ وہ اُسی وقت باکمال ہو سکتی ہے جب اپنا ربط بے عیب اور باکمال ذات خداوندی سے رکھے۔

روحانی طاقتوں کے کارنامے

روح جب بھی اپنی اصلی فطرت پر چلی ہے تو اس سے بلاواسطہ (عناصر اربعہ و موالید ثلاثہ) ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور اس نے مادیات (عناصر اربعہ) سے اپنے غلامی کرائی اور اس کو اپنی روحانیت کے اشاروں پر خوب نچایا ہے۔

(۱) حضرت عمر فاروق اعظمؓ مسجد نبوی کے ممبر پر خطبہ کے دوران "یا ساریہ اِلَی الْجَبَلْ" کی صدا مدینے سے نہاوند کی پہاڑیوں تک جو عراق میں ہیں پہنچادی، یہ فاصلہ تین ہزار کلومیٹر کا ہے۔

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ میں مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر "اعلان حج" کی آواز دی تو وہ عالم کے گوشے گوشے میں ہی نہیں بلکہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچے کے بھی کان میں گونج گئی، حالانکہ مکبّر الصوت (loud speaker) نہیں تھا۔

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسمان کے ایک نئے دروازے کے کھلنے کا تڑاکہ زمین پر بیٹھے بیٹھے سنا۔

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہنم کے گڑھے میں ایک پتھر کے گرنے کا دھماکہ دنیا ہی میں سن لیا جو ۷۰ برس میں اس کی تہ تک پہنچا تھا۔

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی سے پتہ دیا کہ کسی بشر کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا کہ وہ محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ ﴿مَّا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ [ق: ۱۸] حالانکہ اس وقت برقی لہروں کے ذریعے ہوائی آوازیں جذب کرنے کے آلات نہیں تھے۔

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ موتہ کے پورے نقشۂ جنگ کو مسجد نبوی کے ممبر ہی سے معائنہ فرما کر صحابہ کرام کو بتلا دیا۔

(۷) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے حرم میں بیٹھ کر مسجد اقصیٰ کی محرابیں اور طاق تک دیکھ کر گن دیے، حالانکہ اس وقت دوربین نہیں تھی۔

(۸) آپ ﷺ نے صلاۃ خوف میں انہی عرب کی وادیوں میں جنت اور دوزخ کا مشاہدہ فرمایا۔

(۹) آپ ﷺ نے عرفات کے میدان میں شیطان کو واویلا کرتے دیکھا۔

(۱۰) آپ ﷺ نے یوم بدر میں فرشتوں کی جماعتیں دیکھیں۔

(۱۱) حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت سلیمانی پر فضاء میں پروازیں کیں اور ہوائیں ان کے اشاروں پر چلیں اور نبی کریم ﷺ نے نہ صرف فضاء بلکہ سارے آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرمالیا۔

بہرحال اس طرح کے ہزاروں واقعات بطون تاریخ میں موجود ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی طاقتوں کے مالک مادوں کے غلام کبھی نہیں ہوتے بلکہ مادیات ہی ان کے اشارے پر کام کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصلی شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذات حق سے وابستہ رہ کر اپنے کسی فعل میں ان مادیات کا محتاج نہ ہو۔ انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء کرام کے کرامات میں کہیں بھی مادیات سے کوئی مدد نہیں لی گئی، بلکہ وہ محض روحانی آثار کے مظاہرے ہیں جن میں مادیات کو روحانیت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

روح ایک لطیفہ ربانی ہے اور جسم ایک کثیفہ ظلماتی ہے۔ وہ انسان کو عرشی بناتی ہے اور یہ فرشی، وہ اس کو سربلند کرتی ہے اور یہ شرمندہ۔ گویا مادی اور روحانی اخلاق کی مثال ایک ترازو کے دو پلڑوں کی سی ہے۔ اس لیے آپ ان مادی

تصرفات کے ذریعے مادی اخلاق کو جس قدر بھی قوت دیں گے روحانی اخلاق اسی قدر سست ہوتے جائیں گے اور اسی قدر استغناء نفس مٹ کر احتیاج نفس ظاہر ہوتی جائے گی۔ لیکن اگر صدقہ و مجاہدہ یعنی مادیات اور مادی لذات سے بے نیازی کے ذریعے ان روحانی اخلاق کو قوت اور رسوخ کا موقع دیتے رہیں گے، تو احتیاج اور غلامی ختم ہو کر اسی حد تک استغناء و کمال کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی۔ جس سے کائنات میں روح کی حکمرانی قائم ہوتی جائے گی۔

اسلام کے معنی روحانیت کا شغل، اسلام کا شغف، روح کی بلندی اور مادے کی محکومی ہے۔ سائنس کے معنی مادیاتی علم، مادیاتی اعمال اور مادیاتی تجربات اور ان میں ایجادات پھر ان سب سے مادہ کا غلبہ اور روح کی پامالی ہے۔

بدن، کمالاتِ روح کا ذریعہ ہے

عناصر اربعہ سے تیار شدہ بدن ایک ڈھانچہ ہے اور اس کی زندگی "روح" ہے۔ "روح" اس کو زندہ رکھ کر اپنے علوم و کمالات کو اس کے ذریعے عملاً نمایاں کرتی ہے۔ چنانچہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہو کر جب اس مقام معلوم تک پہنچ جاتی ہے جو ازل سے اس کے لیے مقدر ہے تو اس وقت اس ڈھانچے سے روح کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقتاً اصل نہیں ہے بلکہ وسیلہ ہے۔ پس اگر جسم کو جو کہ وسیلہ ہے، مقصودیت کا ذریعہ دے دیا جائے تو فی الحقیقت لاشہ کو مقصود بنا

لینا ہے۔ ان باتوں سے نتیجہ نکلا کہ جس طرح بدن، روح کے لیے وسیلہ عمل ہے اسی طرح سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لیے ایک وسیلہ ہے۔

اگر سائنس کا مقصد صرف عناصر اربعہ پر تحقیقات کرنا اور اس سے تعیشاتی مقاصد پورا کرنا ہے اور اس کو دینی زندگی سے بے تعلق رکھا جاتا ہے تو، ایسی زندگی کو دنیاوی زندگی اور ایسی دلکشی اور چمک کو سطحی زیب و زینت کہتے ہیں۔ (سورہ حدید، آیت ۲۰)

حدیث: الدنیا دار من لا دار له ، ولها یجمع من لا عقل له ۔

مادہ روح کے لیے (خواہ موالید ثلاثہ ہو یا انسانی جسم ہو) وسیلہ عمل ہے مقصد نہیں ہے۔ اور مادے پر تصرّفات یعنی سائنس وسیلہ ہے اور اسلام مقصد ہے۔ اب جب کہ سائنس ایک وسیلہ ہے، عقلی حصول یہ ہے کہ یہ وسیلہ مقصد کے اعتبار سے معین ہو یعنی بقدر ضرورت ہو۔ کیونکہ مقصود دین ہے اور دین سے جدا رہ کر محض سائنس میں مشغولیت رکھنا کوئی عاقلانہ کام نہیں ہے، وسیلہ اپنی حد میں رہے۔ قرآن کی رو سے وسائل میں ترقی کو اضاعت وقت کہا گیا ہے اور مقاصد میں ترقی کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری اور واجب قرار دیا گیا ہے۔ اب اگر وسیلہ، مقصد ہو جائے اور مقصد، وسیلہ۔ تو اس کا مطلب ہوا کہ سائنس، مقصود اصلی ہو گیا اور اسلام جو مقصد تھا وہ وسیلہ اس طرح ہو گیا کہ رسمی، رواجی اور خاندانی اور سطحی اسلام رہ گیا۔

حدیث مذکورہ کی وضاحت:- حدیث کی ابتداء میں فرشتوں کے سوال پر عناصر اربعہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ جو عالَم کا مادہ اور اس کے موالیدِ ثلاثہ کی اصل ہے۔ جن سے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے۔ پھر تذکرہ عناصر میں ان کی شدت اور ضعف کے باہمی مراتب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان میں مٹی زیادہ ضعیف ہے، پھر لوہا، پھر آگ، پانی اور پھر ہوا۔

پھر ان مادی عنصروں سے منتقل ہو کر ان کے مرکب موالید کی طرف رخ کرتے ہوئے موالید کے اعلیٰ ترین جزء یعنی انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ سب سے زیادہ اقویٰ اور رشد انسان ہیں کہ جس کے اشاروں پر تمام مادیات اور سارے ہی موالید چلتے ہیں۔

پھر ان مادیات سے منتقل ہو کر روحانیت کی طرف رخ کیا گیا کہ ابن ادم علی الاطلاق رشد اور اقویٰ نہیں ہے بلکہ اس شرط کے ساتھ کہ وہ روحانی بنے اور مادی نہ رہے۔ یعنی مادیات کو ترک کرتا ہو۔ جس کا بیان صدقے میں فرمایا گیا ہے کہ صدقہ ہی ترک ماسویٰ یا ترک مادیات کا نام ہے۔ پھر کثافت اخلاقی سے پاک ہوتا ہے تو اس صدقہ میں خلوص ہو اور اس کو اخفاء صدقہ کا نام دیا گیا۔

حدیث بالا میں ہر کثیف کو پہلے بیان کیا، اور پھر لطافت کے درجات کو بیان کیا، پھر ہوا سے لطیف انسان، عام انسانوں سے لطیف، تارک الدنیا اور عام تارک الدنیا سے لطیف وہ خاص مخلص تارک اور زاہد بے ریا انسان ہے جس کا قلب

شواغل دنیا سے پاک، مادیات کی محبت سے بالاتر اور روحانی لطافتوں کا محور ہو گیا ہے۔ ایسے لوگ جو بدنوں کے پالنے میں مشغول نہ ہو بلکہ روحوں کی تکمیل میں لگے ہوں۔ اس طرح حدیث سے جہاں قوت اور شدت کا معیار معلوم ہوا وہاں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حصول لطافت کا طریقہ مذہب ہے، جو روحانیت کو مستحکم کر کے لطافت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح روح بادشاہ، عقل اس کا وزیر، اور نفس اس سلطنت کا صفائی کرنے والا۔ اس طرح روح کی منظّم حکمرانی سے روحانیت کا عدل بدن پر پھیل جاتا ہے اور نفس امارہ کیفیت کو چھوڑ کر خود ہی قانون کے تابع ہو جاتا ہے۔ سارے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ سارا عالم دو حصوں (مادیت اور روحانیت، یا سائنس اور اسلام) میں تقسیم شدہ ہے، اور روحانیت کی بنیاد ترک ماسویٰ اور اخلاص ہے۔

حیوانات، جنات، فرشتے اور انسان

انسان کے سوا کائنات کے تین باشعور مخلوقات ایک ایک جوہر کے حامل ہیں۔ "حیوانات" میں صرف ظلم، بربریت ہے۔ اور "جنات" میں صرف شیطانیت ہے، اور "فرشتوں" میں صرف ربانیت ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں ہوئی۔ کوئی محض آگ کے مانند ہے جیسے جنات، کوئی محض ہوا کے مانند ہے جیسے فرشتے اور کوئی محض مٹی یا پانی کے مانند ہے جیسے حیوانات۔ اس طرح نہ جنات میں ارتقائی شان ہے، نہ کسی جن نے آج تک کوئی چیز ایجاد کیا، نہ کسی

حیوان نے کوئی نیا راستہ ڈالا جس سے دنیا کو رہنمائی ملی ہو۔ حیوانوں کا کھانا، پینا، چرنا اور نسل بڑھانا جس طرح پہلے تھا اب بھی وہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب انواع مخلوق یعنی حیوانات، جنات اور ملائکہ اپنے اندر ایک ہی مادہ رکھتی ہیں۔

انسان متضاد قوتوں کا مجموعہ ہے

انسان (اشرف المخلوقات) میں اللہ تعالیٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرمادی ہیں، (حیوانیت، ملکیت، شیطانیت) ایسی صورت میں لازم تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو، جو کہ اکھیری قوتوں سے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً: حیوانیت کا کام کھانا، پینا اور نسل بڑھانا۔ لیکن جب اس کے ساتھ ملکیت ٹکرا جاتی ہے تو تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو عِفَّتُ (پرہیزگاری، پاک دامنی) کہتے ہیں۔ پھر اس سے جائز اور ناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز اور فلاں ناجائز۔ غرض دین کے ہزاروں گوشے اس عِفَّتُ کی بدولت کھلتے ہیں جس سے دین اور دیانت، ترقی کرتے ہیں اور عفت دراصل حیوانیت اور ملکیت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جیسے آگ اور پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ ہے، جس سے تمدن ترقی کرتا ہے۔ اسی طرح شیطانیت کا کام دھوکہ، فریب، دغابازی، مکاری ہے۔ اس کے ساتھ اگر ملکیت کی عقل لڑا دیں تو تدبیر و تدبر پیدا ہوگا، جس سے مکر و فریب کے بجائے عقل سے خیر کی

تدابیر کا ظہور ہوگا اور جن کی تدبیروں کا حسن نمایاں ہوگا، جنگ اور امن کی نئی نئی تدابیر عمل میں آئیں گی۔

درندوں میں قوت غضبیہ (قہر) ہے۔ جس کا نتیجہ تباہی ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی بردباری کو ٹکرا دیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے، جس میں عقل اور ہوش کے ساتھ جوش اور بہادری کے ساتھ دلیری اور دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال شہوت و غضب اور مکر و فریب کے ساتھ اگر قوت عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور علمی، عقلی اور دینی ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جو صرف انسان ہی سے ممکن ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ ترقی کی راہیں اگر کھل سکتی ہیں تو صرف انسان ہی پر اور انسان ہی سے کھل سکتی ہیں۔ انسان ہی نے ایجادات سے دنیا کو سجایا۔ اسی طرح اجتہادات، نقل اور روایات، تجربہ، علم اور معرفت، قرب، اطاعت، بصیرت یہ سب انسان کے سوا کسی نے کر کے نہ دکھلا سکا۔ پھر اسی ہمہ جہتی ارتقاء کی بدولت فرشتوں سے کہیں زیادہ اونچا ہو گیا، جبرائیل علیہ السلام کی رسائی سے بھی آگے نکل گیا۔ یہ سب قوت عقلیہ کا قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ اور قوت بہیمیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے، گر دل بے مدعا ہوتا

قوائے شر کا، عقل پر غالب آجانے کا نتیجہ

اس ٹکراؤمیں اگر عقل مغلوب ہو جائے اور قوتیں عقل کے مقابل غالب آجائیں یعنی عقل ان مادوں کا خادم بن جائے اور پھر ان کے تقاضوں کو اپنی تدابیر سے پورا کرنے کی خدمت پر لگ جائے تو پھر حیوانوں سے چار ہاتھ آگے کا حیوان اور شیطان سے آگے کا شیطان ہو کر ایسے انسان کی عقل اور دماغ برائیوں کے وہ وہ طریقے ایجاد کرتے ہیں کہ شیطان صدیوں غور و فکر کر کے بھی ایسی برائیاں ایجاد نہ کر سکے۔

غرض ان خلقی قوتوں کے ٹکراؤمیں اگر عقل غالب رہتی ہے تو یہ "احسنِ تقویم" کا ثبوت پیش کرنے کے مترادف ہے اور اگر عقل پر یہ خلقی قوتیں غالب آگئی تو ایساانسان " اسفل السافلین" میں کھڑا نظر آئے گا۔

علم ربّانی اور عقل طبعی

علم ربانی سے انسان کی فضیلت ہے لیکن بلا علم کے عقل طبعی غالب نہیں آسکتی، عقل طبعی، طبعی قوتوں کا ساتھ دے گی اور ان کو اپنا کام کرنے کے لیے نئے نئے راستے بتلائے گی۔ لیکن عقل جب علم ربّانی کی وجہ سے عارف ہو جائے گی تو ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی اور پھر ہر شعبہ زندگی میں "انسانی کمالات" کا ظہور ہو گا، اس لیے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات (حیوانات، جنات، فرشتے) پر عقل محض یا عقل طبعی سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ علم سے ثابت ہوتی

ہے۔وہ علم جو طبعی نہ ہو بلکہ ربّانی علم ہو۔ جو بذریعہ وحی، حق کی طرف سے آیا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے، عقلوں کو جلا دیتا ہے اور دماغوں کو چمکدار کرتا ہے،آدمی کو آدمی بناتا ہے۔

اس لیے ہمارا فطری اور عقلی فریضہ ہو جاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الٰہی علم کو حاصل کریں اس علم کا دوسرا نام "شریعت" ہے۔

ایک تجزیہ: حیوانیت، جو جہالت کے ساتھ، عیاشی، فحاشی،بدکاری میں مصروف تھی وہ اب شریعت کے تابع ہو کر عفت، عصمت، پاکی، پاکدامنی، پرہیزگاری اور نیکوکاری کی طرف لائے گی۔ شیطانیت، جو جہالت میں مکاری، عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھی اب تابع فرمان الٰہی ہو کر تدبیر، دانائی، عافیت، سلامتی کی طرف لے آئے گی۔ بالفاظ دیگر جبلت نفسانی سے نکال کر فطرت روحانی کی طرف لائے گی۔ اس طرح طبیعت پر حکومت عقل قائم کرے گی اور عقل پر حکمرانی شریعت کی ہو گی۔

اس طرح شریعت انسان کے کسی خلقی مادے کو ضائع کرنے کے لیے نہیں آئی، بلکہ صحیح مصرف بتلا کر صحیح راہ پر لگانے کے لیے آئی ہے۔ یہی معنی ہیں اسلام کے دین فطرت ہونے کا کہ اس نے ہر قوت کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب، درندگی ہو یا شیطانیت کسی کو بھی بیکار ہونے نہیں دیا بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلا دیا ہے۔ نیکی تو بجائے خود نیکی ہے لیکن اس نے بدی کو بھی علی

الاطلاق نہیں مٹایا، بلکہ فرمایا کہ اگر بھائی آپس میں لڑتے ہیں تو جھوٹ بول کر صلح کرادو تو نہ صرف یہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ہے۔

شریعت نے طبعی قویٰ کو شر سے خیر کیطرف موڑا ہے

اس طرح جھوٹ جیسی چیز کو شریعت نے مٹایا نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے حکم پر چلایا ہے۔ گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے اور اگر شریعت اور حق کے خلاف ہو تو گناہ ہو جاتا ہے۔

"غیبت" سچ بولنے کو کہتے ہیں، یعنی کسی واقعے کو اس کے پیٹھ پیچھے بیان کرنے کا نام غیبت ہے، شریعت نے ایسی سچائی کو منع کر دیا اور اس کو حرام رکھا۔ (غیبت، سچائی کو کہتے ہیں اور اگر وہ جھوٹ ہے تو پھر بہتان ہوگا، (غیبت نہ ہوگی) نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے اور نہ جھوٹ گناہ، بلکہ شریعت پر نہ چلنا گناہ ہے اور شریعت پر چلنا عبادت ہے۔

یہی نماز تین اوقات میں منع ہے۔ طلوع، غروب اور نصف النہار۔ اس سے پتہ چلا کہ نماز نہ پڑھنا ان اوقات میں عبادت ہے۔ ماہ رمضان میں روزہ فرض اور اگر ترک کیا تو گناہ گار، لیکن عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، خودکشی حرام ہے، مگر جہاد میں اپنے کو قتل کے لیے پیش کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ نہ جان دینا عبادت ہے اور نہ بچانا، بلکہ کہا ماننا اور ہر وقت تعمیل حکم کرنا عبادت ہے۔

نسان کی پیدائشی ترکیب
آگ
پانی
ہوا
مٹی
قلب کی خاصیت
اوصافِ درندگی
غصّہ کیوجہ سے
عداوت، گالی
گلوج، ظلم۔
اوصافِ شیطانی
شیطان کے وجود
سے مکر، فریب
جھوٹ۔
اوصافِ حیوانی
شہوات،
خواہشات مسلط
ہونے سے
، حرس، فحش۔
اوصافِ ربّانی
علم ربّانی کی وجہ
سے، تواضوع
، عفّت، قناعت۔
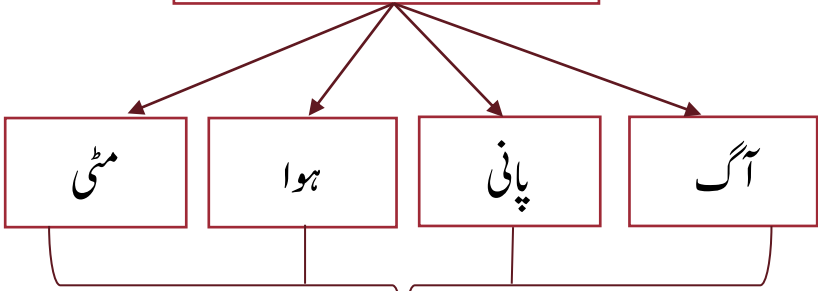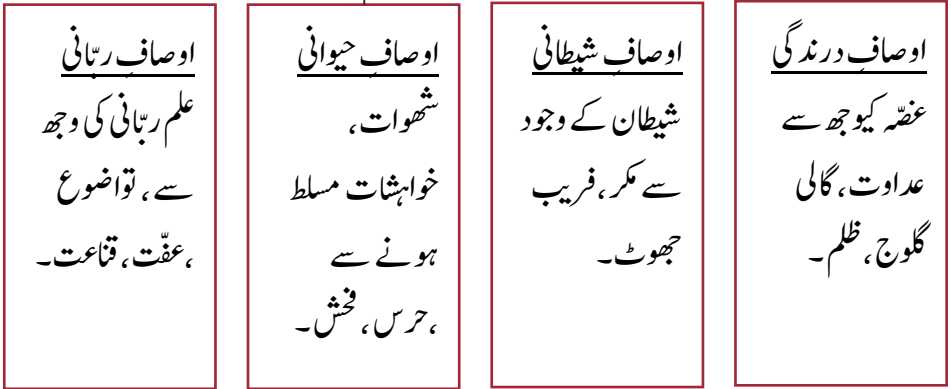
میری آوارہ مزاجی کو نیا موڑ دیا
پابہ زنجیر کیا اور مجھے چھوڑ دیا
لآ اِلٰہَ اِلّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَسُوْل اللّٰہِ

انسان کو فرشتوں پر فضیلت دیے جانے کی وجہ

عبادت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) افعال خیر

(۲) افعال معصیت (گناہ، قصور، خطا)

پہلی قسم: کو شریعت میں "بِر" اور دوسری قسم کو" تقویٰ" کہتے ہیں۔ غور کرنے پر پتہ چلا کہ انسان نہ صرف علم میں فرشتوں سے آگے ہے بلکہ عبادت میں بھی فوقیت رکھتا ہے۔ جیسے تقویٰ، شر سے اور گناہ سے بچنے کو کہتے ہیں اور بچا اسی چیز سے جاتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ فرشتوں میں نہ شر کا مادہ ہے اور نہ گناہ ہی کر سکتے ہیں اس لیے ان کو بچنے (تقوے) کا حکم نہیں دیا گیا۔

اس کے برخلاف انسان میں شر ہے، وہ کر سکتا ہے۔ اس لیے اس کو شر سے روکا گیاہے اور وہ اگر ارادۃً رکتا ہے تو یہی تقویٰ کہلاتا ہے۔ اس طرح تقویٰ کی عبادت فرشتوں کے لیے نہیں ہے، یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ انسان اس نوع عبادت میں ملائکہ سے آگے بڑھ گیا۔

دیگر عبادات: فرشتے عزیز و اقارب نہیں رکھتے اور نہ ان میں افزائش نسل کا سلسلہ ہے اور نہ معاملات، نہ لین دین، جیسے کہ انسانی زندگی میں ہیں، اور نہ ان میں معاشرتی اور نہ امور خانہ داری کے لوازمات۔ اس کے برخلاف انسان آپس میں معاملہ داری بھی کرتا ہے، نسلی افزائش، آپسی صلح و آشتی، صلح رحمی وغیرہ کے امور ہیں اور یہ سب عبادات ہیں۔ اس طرح عبادت کا ۲/۳ حصہ انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔

اعتقادات: یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اعتقاد کی اصل " ایمان " ہے اور یہ ایمان بالغیب ہے۔ فرشتوں کے حق میں کوئی چیز غیب کی نہیں ہے کہ ان کو ایمان لانے کی دعوت دی جائے، اس لیے اعتقادات (ایمانیات) کا حصّہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ اب رہ گئے ادائیگی فرائض، یعنی (نماز، روزہ، زکوۃ، حج) معاشرے کے لیے مال کی ضرورت ہے، فرشتوں میں نسل نہیں ہے، اس لیے معاشرہ نہیں، اس لیے مال کے لین دین کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ عبادت بھی انسان کے حصے میں ہے۔ فرشتوں کے لیے نہ کھانا ہے نہ پانی اب رہ گئی نماز تو نماز ادا کرنا فرشتے کی طبعی بات ہے اور فرشتہ طبعی تقاضے کے تحت انجام دیتا ہے۔ انسان کا ایک سجدہ جو خلاف طبعی کو برداشت کر کے ہوتا ہے، وہ فرشتے کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ بہرحال یہ نتیجہ نکلا کے انسان عبادات میں فرشتوں سے افضل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں حیوانیت، شیطانیت والی قوتیں ہیں جن کی بدولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور فرشتوں میں یہ دونوں قوتیں نہیں ہیں اس لیے وہ ۳/۲ دین سے الگ ہیں۔

اب انسان میں قوت عقلی ہے جو فرشتے سے زیادہ ہے اس لیے انسان طاعت اور عبادت میں وہ انواع پیش کر سکتا ہے جو فرشتے نہیں پیش کر سکتے۔ الغرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند اور انسانوں پر کھلے ہوئے ہیں۔

اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانون خداوندی کے تحت گزارنا ہے۔ سو جامع زندگی انسان کو ملی ہے، وہ کسی کو نہیں ملی۔ اس لیے اسلام اور تسلیم اور رضائے الٰہی صرف انسان ہی کے لیے ہے۔ رضائے حق کے لیے جینا، رضائے حق کے لیے مرنا، اس کی خوشنودی کے لیے صلح کرنا، اسی کے لیے لڑنا، اسی کے لیے محبت کرنا، اسی کے لیے عداوت، اسی کے کہنے پر دینا، اسی کے کہنے سے رکنا ہے۔

مذکورہ افعال فرشتہ نہیں کر سکتا، اس میں نہ شہوت ہے، نہ شیطانیت ہے، نہ غفلت ہے، نہ غرور ہے۔ اس لیے جو افعال انسان کر سکتا ہے وہ فرشتہ نہیں کر سکتا۔ فرشتوں میں وہ مادہ ہی نہیں ہے کہ جن کی روک تھام سے عبادت کی مختلف شکلیں بے شمار بنتی ہیں۔ اس لیے فرشتوں کو ان علوم کی ضرورت بھی نہیں تھی جو کہ انسان کو تھی۔ جس قدر مادی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں اتنے ہی دفاع اور

مدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لیے ضروری تھا۔ اس طرح انسان کا علم بھی کامل اور عبادات بھی جامع، ساری کائنات میں اشرف اور یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائب خداوندی اس کو ملے، کیونکہ کمالات خداوندی لامحدود ہوتے ہوئے بھی اصولاً دو قسموں پر منحصر ہیں:

(۱) کمالات علم

(۲) کمالات عمل

ان دونوں میں انسان ہی ساری مخلوق میں آگے نکلا۔ ایسی صورت میں خدا کا نائب بھی وہی ہو سکتا ہے۔ " عمل " چونکہ علم کے تابع ہے اس لیے اصل بنیاد " خلافت علم " ہی ٹھہرتا ہے جو کہ انسان ہی میں حد کمال تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لیے اس کو خلیفہ الٰہی بنایا گیا۔

خلافت کیا ہے؟: اللہ کا نائب بن کر کائنات میں تصرف کرنا، جیسے: انبیاء علیہم السلام کیے، صحابہ کرام کیے، تابعین اور تبع تابعین کیے، علماء اور مشائخین کرام نے کیے۔

شرف انسانی کے بارے میں دعویٰ شریعت: شریعت نے انسان کے اشرف ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ) عقل بھی اس بات کی شاہد ہے اور محسوسات بھی شاہد ہیں کہ انسان ہی اشرف ہے! کیونکہ انسانی تصرف ساری کائنات میں ہے۔ بحر میں، بر میں، فضاء میں، خلاء میں۔

وجہ اشرفیت:

(۱) انسان "عقل" کی وجہ سے اشرف نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کم و بیش دوسرے حیوانات میں بھی موجود ہے، کہ جس طرح انسانوں کے مابین عقلی کمی ہوتا ہے۔ بہر حال مطلّقاً عقل و شعور ہر جاندار کو دیا گیا ہے۔

(۲) "علم" محض بھی وجہ اشرفیت نہیں ہے۔ کیونکہ جانوروں کو بھی علم دیا گیا ہے۔ شریعت کا علم (جبلی طور پر) بھی جانوروں کو ہے، بندگی اور اطاعت کا علم بھی ہے، ہر ایک کو اپنی نماز، اپنی تسبیح کا علم ہے۔

انتقال علوم انسانی خصوصیت ہے

تعلیم یعنی دوسروں کو علم سکھانا۔ یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت کسی مخلوق میں نہیں ہے اور اگر ہے تو طبعی انداز میں ہے کہ اللہ نے وہ بات اس کے دل میں ڈال دی ہے۔ اس طرح مُعلّمِیُ۔ تعلیم و تلقین اور تربیت انسانی یہی انسان کے لیے وجہ اشرفیت ہیں اور یہی وجہ افضیلت ہے۔ ایک انسان ہی ہے کہ وہ ہزاروں علوم کو لاکھوں لوگوں میں منتقل کر سکتا ہے، یعنی علم کا اکتساب اور پھر جدوجہد سے اس کو دوسروں تک پہنچایا۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"انّما بُعثتُ معلماً" اور آپ ﷺ نے ۱،۲۴۰۰۰/ نمونے تیار کر دیے اور خود نبوت بھی تو تعلیم ہی ہے کہ انبیاء اللہ والا علم بندوں تک پہنچاتے ہیں اور نبوت

بجز انسانوں کے کسی کو نہیں دی گئی اور تعلیم سے بڑھ کر کوئی خصوصیت نہیں ہے، جو صرف انسان کے اندر ہے۔ محض تعلیم ہی کی وجہ سے علم رسول ﷺ ہم تک پہنچا۔ صرف علم کافی نہیں ہے بلکہ تعلیم ہو، اس کو ایک سے دوسرے تک پہنچانے کی صلاحیت ہو، مدارس بقاء انسانیت کا ذریعہ ہیں۔

انسانی جسم، انسانی روح کے لیے کارخانہ ہے

اسلام کا نقطہء نظر یہ ہے کہ انسان کی روح کو خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ کچھ اختیارات، کچھ فرائض اور کچھ ذمہ داریاں اس کے سپرد کی اور ان سب کو ادا کرنے کے لیے ایک بہترین اور موضوع ترین ساخت کا جسم اسے عطا کیا تاکہ اختیارات اور خدمات انجام دیتے رہے۔ لہٰذا یہ جسم، روح کا قید خانہ نہیں ہے بلکہ اس روح کا کارخانہ ہے کہ اس روح کی ترقی اگر ممکن ہے تو اس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کارخانے کے آلات (عقل، اختیار، آزادی، شرع وغیرہ) اور طاقتوں کو استعمال کر کے اپنی قابلیتوں کا اظہار کرے۔

یہ دنیا کیا ہے؟ یہ دارالعذاب نہیں ہے کہ انسانی روح اس میں آکر پھنس گئی، بلکہ یہ تو کارگاہ ہے جس میں کام کرنے کے لیے خدا نے اس کو بھیجا ہے اور یہاں کی بے شمار چیزیں اس کی تصرف میں دی گئی ہیں اور سارے انسان اسی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اس کے ساتھ پیدا کیے گئے ہیں۔

یہاں فطرت کے تقاضوں سے تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست اور دیگر شعبہ ہائے زندگی اس کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ یہاں روحانی ترقی ممکن ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی اس دنیا کے اندر کام کر کے اپنی قابلیت کا ثبوت دے، اس کے لیے یہاں دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔

زندگی کا ہر شعبہ اور ہر پہلو گویا امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ گھر، محلّہ، بازار، منڈی، دفتر، کارخانہ، دکان، تجارت، زراعت، صنعت، ملازمت، کھانا، چھاونی، پارلیمنٹ، کانفرنس، میدان جنگ، جلوت، خلوت، دولت، فقیری۔ یہ سب مختلف قسم کے مضامین کے پرچے ہیں۔ ان سب پرچوں سے گزرنا ہی امتحان اور آزمائش ہے۔ اگر پرچوں کو سادہ ہی چھوڑ دیا گیا تو نہ امتحان ہوا نہ نتیجہ نکلا۔ کامیابی و ترقی کا امکان اگر ہو سکتا ہے تو ایک طریقہ ہے کہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری توجہ امتحان دینے میں صرف کریں۔

گویا اسلام ساری راہبانہ زندگی کو رد کرتا ہے اور انسان کے لیے روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے باہر نہیں ہے بلکہ دنیا کے اندر ہے۔ روح کی نشو و نما ترقی اور کامیابی کی اصل جگہ کارگاہ حیات (دنیا) ہے اور عین اس کے مجدھار میں ہے نہ کہ اس کے کنارے پر۔

منصب خلافت

خلیفہ ہونے کے اعتبار سے انسان اپنے پورے کارنامہ حیات کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس کا فرض ہے کہ زمین میں جو اختیارات اور ذرائع اس کو دیے گئے ہیں ان کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے، جو قابلیتیں اور جو صلاحیتیں اس کو بخشی گئی ہیں، ان کو زیادہ سے زیادہ خدا کی رضا حاصل کرنے میں صرف کریں۔ ملے میں ایسا رویہ اختیار کرے جو خدا پسندیدہ ہے اور فی الجملہ اپنی تمام کوشش، محنت اس راہ میں صرف دیکھنا چاہتا ہے۔ اس خدمت کو انسان جس قدر زیادہ وحساس ذمہ داری، فرض شناسی، طاعت اور فرمانبرداری اور مالک کی رضا جوئی کے ساتھ انجام دے گا اسی قدر زیادہ وہ اللہ کے قریب ہوگا اور خدا کا قرب ہی اسلام کی نظر میں روحانی ترقی ہے۔ اس کے برعکس وہ جس قدر سست، کام چور اور نہ فرض شناس، خودرخی زندگی گزارنے والا، باغی، سرکش اور نافرمان ہوگا اتنا ہی وہ خدا سے دور ہوگا اور خدا سے دوری کا نام اسلام میں روحانی تنزُّل ہے۔

کارگاہِ حیات ایک ہے

اسلامی نقطہء نظر سے دیندار اور دنیادار دونوں کا دائرہ عمل ایک ہی ہے، کام اور عمل کی جگہ ایک ہی ہے، گھر کی چار دیواری سے لے کر بین الاقوامی کانفرنس کے چوراہے تک جتنے بھی زندگی کے معاملات ہیں ان سب کی ذمہ داری دونوں پر ہے، دیندار پر اور دنیادار پر۔ البتہ جو چیز ان دونوں کو الگ کرے گی وہ خدا کے

ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت ہے۔ کہ دیندار جو کچھ کرے گا وہ اس احساس کے ساتھ کرے گا کہ وہ خدا کے سامنے ذمہ دار ہے، چنانچہ الٰہی قانون کی روشنی میں کرے گا اور الٰہی خوشنودی کے حاصل کرنے پر نظر رکھے گا۔ اس کے بر عکس جو کچھ دنیادار کرے گا وہ غیر ذمہ دارانہ طریقے پر کرے گا، خدا سے بے نیاز ہو کر کرے گا، بس یہی فرق دیندار کی پوری مادی زندگی کو روحانی اور دنیادار کی ساری زندگی کو روحانیت کے نور سے محروم کر دیتا ہے۔

اسلام میں مومن کی روحانی ترقی کا طریقہ حسب ذیل ہے

(۱) ایمان: اس راستے کا پہلا قدم ایمان ہے۔ یعنی آدمی کے دل و دماغ میں یہ اعتقاد بس جانا کہ خدا ہی اس کا خالق، رازق، رب، معبود اور حاکم ہے، خدا ہی کی رضا کے لیے محنتوں کا مقصود ہے، خدا ہی کا حکم اس کی زندگی کا قانون ہے، وہ حاکم یہ محکوم، وہ خالق یہ مخلوق، وہ معبود یہ عابد، وہ مختار یہ محتاج، وہ بے نیاز اور یہ نیاز مند۔ یہ اعتقادات جس قدر پختہ ہوں گے اتنا ہی زیادہ اس کی اسلامی ذہنیت بنے گی، پھر اس پر روحانی ترقی کی صورت پیدا ہو گی۔

(۲) اسلام (طاعت): ایمان کے بعد اس راہ کی دوسری منزل طاعت ہے یعنی مذکورہ اعتقاد کے مطابق زندگی میں عملاً اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ اپنے ارادے اختیار سے دستبردار ہو جانا۔ نظم کائنات (تخلیقی منصوبہ) سے ہم آہنگی کرنا وغیرہ۔

(۳) تقویٰ: اس راہ کی تیسری منزل تقوی ہے، جس کو عام زبان میں فرض شناسی اور احساس ذمہ داری سے تعبیر کرتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر پہلو میں یہ سمجھتے ہوئے کام کرے کہ اس کو اپنے افکار، اقوال اور افعال کا خدا کو ایک دن حساب دینا ہے۔ چنانچہ تقویٰ یہ ہے کہ مومن پوری ہوش مندی کے ساتھ خیر اور شر، حلال اور حرام کے درمیان تمیز کرتا ہوا چلے۔

(۴) احسان: یہ روحانی ترقی کی اونچی منزل ہے۔ "احسان" کے معنی یہ ہیں کہ بندے کی مرضی، خدا کی مرضی کے ساتھ متحد ہو جائے، جو خدا کو پسند وہی بندے کو پسند، جو خدا کو ناپسند وہ بندے کو ناپسند، اس کے لیے جان اور مال لگا دے، اس مقام پر پہنچ کر بندے کو اپنے خدا کا قرب ملتا ہے اور یہ روحانی ارتقاء کی بلند ترین منزل ہے۔

اسلام میں روحانی تربیت کا نظام

<u>پہلا رکن نماز</u>: روزانہ پانچ وقت ذہن میں خدا کی یاد تازہ کرنا، اس کا خوف قائم رہنا، اس سے محبت پیدا ہونا، اس کے احکام بار بار سامنے آنا، اس کی اطاعت کی مشق ہوتے رہنا وغیرہ۔ یہ نماز محض انفرادی نہیں ہے بلکہ اس کو جماعت کے ساتھ فرض کیا گیا ہے تاکہ پوری سوسائٹی مجموعی طور پر روحانی ترقی کی اس راہ پر سفر کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

<u>دوسرا رکن روزہ</u>: یہ مجمعی طور پر سب کو تقویٰ کی تربیت دیتا ہے۔

تیسرا رکن زکوۃ: یہ مسلمانوں میں مالی ایثار، آپس کی ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

چوتھا رکن حج: یہ خدا پرستی کے محور پر اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری بناتا ہے اور ایک ایسی بین الاقوامی تحریک چلاتا ہے جو دنیا میں صدیوں سے دعوت حق دے رہی ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف و جملہ معاونین و اہل و عیال کو اجر کثیر سے نوازے اور اس کتاب کو ان کی میزان میں حسنات کا ذخیرہ بنا دے اور اس کا نفع عام فرما دے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا یقین، عقل سلیم اور فکر مستقیم عطا فرمائے۔

مؤلف

الحاج قاری محمد ارشاد علی

مولوی عالم (نظامیہ) بی۔کام (عثمانیہ)

ڈی۔یف۔ی۔ ناگپور کالج

" مولف کتاب "اصلاحی تحفہ" خادم تدریس القرآن باہتمام

باہتمام